حکمتِ اقبال (۳۴)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور سائنس (۳)

مقصودِ مکتب

اس دور میں مسلمانوں نے بھی اپنی تاریخ و روایات اور قرآن کے ارشادات کو فراموش کر کے عیسائی مغرب کی کورانہ تقلید میں مغرب کی بے خدا سائنس کو، جسے اقبال "اندیشۂ لادین" کہتا ہے، اپنا لیا ہے۔ اس وقت تمام عالمِ اسلامی میں مسلمانوں کے مدرسے، کالج اور یونیورسٹیاں بے خدا سائنس کی درس و تدریس میں مصروف ہیں، جس کی وجہ سے پورے عالمِ اسلامی میں نوجوان تعلیم یافتہ افراد اسلام سے دُور اور دُور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال اس صورتِ حال پر بار بار اظہارِ افسوس کرتا ہے۔ اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہمیں مدرسہ اور کالج میں خدا کا عقیدہ پھر اپنے مقام پر واپس لانا چاہیے۔ تعلیم کا تو مدّعا ہی یہ تھا کہ خودی کو اپنی زندگی کے ایک ہی مقصد کی تکمیل کے لیے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اور یہ مقصد علم اور عمل کے ذریعہ سے خدا کی محبّت کے جذبہ کی آزادانہ نشوونما اور تسکین اور تشفّی ہے۔ اقبال کو افسوس ہے کہ مکتب کو اپنے مقصود کا ہی علم نہیں۔ جبھی تو وہ خدا کی محبّت (جذبِ اندروں) کی پرورش کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔

مکتب از مقصودِ خویش آگاہ نیست
تا بجذبِ اندرونش راہ نیست

خدا کی محبّت کی شراب (مئے یقین) ہی زندگی میں سوز یا گرمیٔ عمل پیدا کر سکتی ہے۔ خدا کرے کہ توحید کا عقیدہ نظامِ تعلیم کی بنیاد بنے تاکہ یہ گرمی پیدا کرنے والا آگ کی طرح کا پانی مدرسہ کو بھی نصیب ہو۔

مئے یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پُرسوز
نصیبِ مدرسہ یارب یہ آبِ آتش ناک!

دورِ حاضر کے مکتب کا بے خدا نظامِ تعلیم طالب علم کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ عمر بھر خدا کا

نام لے سکے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کسی کا گلا گھونٹ دیا جائے کہ پھر اس سے لا الٰہ الاّ اللہ کی صدا نہ نکل سکے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الاّ اللہ؟

مغربی نظامِ تعلیم جو اب مشرق میں بھی رائج ہے، اس اصُول پر مبنی ہے کہ طالب علم کو کسی عقیدہ کی تعلیم نہیں دینی چاہیے، تاکہ اس کی عقل آزاد رہے اور اس میں خود ہر بات پر غور و فکر کر کے اُسے ردّ یا قبول کرنے کی صلاحیّت پیدا ہو۔ اگر استاد کی طرف سے اس پر کوئی عقیدہ ٹھونسا گیا تو پھر اس کی سوچ وبچار ایک تنگ دائرے کے اندر مقید ہو جائے گی۔ لیکن اس اصُول پر عمل کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ طالب علم کی عقل تو آزاد ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ اس کے خیالات کا کوئی مرکز یا محور نہیں بنتا، وہ بغیر کسی ضبط یا نظم کے رہ جاتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ طالب علم کے اندر اس عقیدہ کو پیدا کیا جاتا اور پختہ کیا جاتا جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے اور جس کے لیے اس کی فطرت پیاسی ہے، یعنی خدا کا عقیدہ! ایسی حالت میں اس کے ذہن پر کوئی خارجی اور مصنوعی دباؤ نہ پڑتا بلکہ وہ اپنی فطری آزادی کو حاصل کر لیتا اور اس کو غلام بنانے والے یا اس کی فطرت سے ہٹانے والے تمام تصوّرات خارج از بحث ہو جاتے اور اس کے ساتھ ہی اس کے خیالات کے اندر ایک ربط یا نظم بھی پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ پھر یہ عقیدہ اس کے تمام خیالات کا مرکز یا مدار بن جاتا اور وہ ان کو اپنے اس عقیدہ کو روشنی میں دیکھ سکتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغرب میں ایسے نظامِ تعلیم کے پیدا کیے ہوئے تعلیم یافتہ افراد کے دِلوں میں خدا کی محبّت مردہ ہوتی ہے۔ اور اگر مشرق میں ایسے نظامِ تعلیم کے باوجود خدا کی محبّت پھر بھی زندہ رہتی ہے تو مکتب کی راہ نمائی نہ ہونے کی وجہ سے مکتب جو خیالات اور افکار طالب علم کے ذہن میں پیدا کرتا ہے وہ خدا کے عقیدہ کے ساتھ ملحق نہیں ہوتے اور ان میں کوئی فطری ربط نہیں ہوتا اور وہ مغرب کے گوناگوں غیر فطری عقائد کے تصرّف میں آجاتے ہیں۔ ایسی حالت میں عقل مغرب کی غلامی کی وجہ سے غلط طریق پر کام کرتی اور غلط سمت میں سوچتی ہے۔

مدرسے عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لا دینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

اگرچہ خدا کا عقیدہ انسان کی فطرت ہے۔ تاہم یہ مشتِ خاک انسان اس طرح سے بنا ہے کہ اگر اس کی مناسب قسم کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو وہ اپنی فطرت کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اور غلط اور ناقص تصوّرات کو خدا سمجھ بیٹھتا ہے۔ اگر ہمارا خیال یہ ہو کہ اگر ہم طالب علم کو آزاد رہنے دیں تو اس کے دل میں خدا کی محبّت خود بخود پیدا ہو جائے گی، اس لیے کہ یہ اس کی فطرت ہے، تو یہ خیال درست نہیں۔ خدا کے عشق کی آتش ہمہ سوز خودی کی مناسب پرورش اور تربیت کے بغیر روشن نہیں ہوتی۔ صوفیاء کا قول ہے کہ خدا کی محبت ایک آگ ہے جو ما سوی اللہ کو جلا دیتی ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز

خدا کے عقیدہ کو کالج کے سائنسی علوم سے نکال دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص اپنا گھر روشن دیکھنا چاہتا ہو لیکن ایک بڑی سی دیوار بنا کر سورج کی روشنی کو مسدود کر دے۔ پروفیسر ایک عمارت گر ہے اور جو عمارت وہ تعمیر کر رہا ہے وہ روحِ انسانی ہے۔ حکیم قاآنی نے ایک عمدہ بات کہی ہے جو ہر پروفیسر کو مدِّنظر رکھنی چاہیے کہ اگر اپنے گھر کے صحن کو روشن رکھنا چاہتے ہو تو صحیح عمارت گری یہ ہے کہ سورج کے سامنے دیوار کھڑی نہ کرو۔

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر　　جس کی صنعت ہے روحِ انسانی
نکتۂ دلپذیر تیرے لیے　　کر گیا ہے حکیم قاآنی
پیشِ خورشید بر مکش دیوار　　خواہی ار صحنِ خانہ نُورانی

متاعِ دین و دانش کا زیاں

پھر بھی ہم یہ تمنّا رکھتے ہیں کہ ہماری نئی نسلیں صحیح طور پر مسلمان ہوں۔ گویا ہم بے خدا سائنس کے روح فرسا نتائج اور اثرات سے بالکل بے خبر ہیں۔ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو بلند ترین کتابوں کے ذریعہ سے یہ بتائیں کہ علمِ اخلاق، علمِ سیاست، علمِ اقتصادیات، علمِ تعلیم، علمِ قانون وغیرہ میں خدا کہیں نہ آتا ہے اور نہ آسکتا ہے، اور پھر یہ توقع رکھیں کہ ان نوجوانوں کی اخلاقی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور قانونی سرگرمیاں با خدا ہوں گی۔ لہٰذا اقبال تنبیہہ کرتا ہے کہ اس بے خدا سائنس کی تعلیم کو بے خطر نہ سمجھو۔

اس سے تمہاری پوری قوم کی رُوح فنا ہو رہی ہے۔

مشو ایمن ازاں علمے کہ خوانی!
کہ از وے رُوحِ قومے را تواں کشت

ہمارے کالجوں کی بے خدا سائنس کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مغربیّت اور جدیدیّت کے کافر ادا معشوق کے خونریز غمزوں پر ایسے مرمٹے ہیں کہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس طرح سے ہم نے دین کی متاع کو ہی نہیں بلکہ دانش (یعنی سچی باخدا سائنس) کی متاع کو بھی لٹا دیا ہے۔ حالانکہ اللہ والوں کی حیثیت سے دین اور دانش کی دونوں نعمتیں ہمارے لیے ہی مخصوص تھیں۔

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی!

غیروں کی تربیت دی ہوئی اور غیروں کے نظریۂ کائنات میں رنگی ہوئی بے خدا سائنس کا پڑھنا اور پڑھانا ایسا ہی ہے جیسے اپنے منہ کو غیروں کے تیار کیے ہوئے غازہ کے استعمال سے خوبصورت بنانے کی کوشش کرنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی قدر و قیمت کو دوسروں کے شعار کی نقل پر موقوف سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اپنے قومی امتیازات کو بالکل کھو چکے ہیں، ہماری عقل دوسروں کے خیالات کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے اور خود آزادی سے کچھ نہیں سوچ سکتی، ہماری ذہنی اور ثقافتی زندگی کا ہر سانس دوسروں کا محتاج ہو گیا ہے، ہماری زبانوں پر ایسی گفتگو ہے جو دوسروں سے مانگی ہوئی ہوتی ہے، اور ہمارے دلوں میں ایسی آرزوئیں ہیں جو دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہیں۔ اقبال اس صورتِ حال پر افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے:

علمِ غیر آموختی اندوختی رُوئے خویش از غازہ اش افروختی
ارجمندی از شعارش مے بری من ندانم تو توئی یا دیگری،
عقلِ تو زنجیریٔ افکارِ غیر در گلوئے تو نفس از تارِ غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار در دلِ تو آرزو ہا مستعار
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

عالمِ نو کی نقشبندی

توحید کا عقیدہ جب مظاہرِ قدرت کے علم کے ساتھ یعنی سائنس کے طبیعیاتی، حیاتیاتی

اور نفسیاتی حقائق کے ساتھ مل جاتا ہے تو اس کے اندر جاذبیت اور کشش کی ایک ایسی قوّت پیدا ہو جاتی ہے جس کا حملہ ہمارے بدترین دشمنوں کو بھی بے بس کر سکتا ہے۔ یہ قوت ایک ایسا آلۂ حرب و ضرب بن جاتی ہے جس کا مقابلہ دورِ حاضر کے بہترین سامانِ حرب سے بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس قوّت کا حملہ دشمنوں کے دلوں کو مسخّر کر کے ان کو دوست بنا دیتا ہے اور پھر ان میں مقابلہ کی ہمّت ہی باقی نہیں رہتی۔ بلکہ وہ اپنا سارا سامانِ حرب بخوشی حملہ آوروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ گویا اگر عقیدۂ توحید سائنس کے ساتھ مل جائے تو وہ ایک ایسا سامانِ جنگ بن جاتا ہے جس سے ہم دوسروں کو تیغ و تفنگ کے بغیر مغلوب کر سکتے ہیں۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

یہی وجہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ سائنس کو عقیدۂ توحید کے ساتھ ملحق کر کے ایک پُر امن عالمگیر انقلاب پیدا کریں۔ اہلِ مغرب کے لیے سائنس (زیرکی) زندگی کا سامان ہے۔ اہلِ مشرق کے لیے خدا کی محبّت کائنات کا راز ہے۔ سائنس خدا کی محبّت کے ساتھ مل کر حق شناس بن جاتی ہے۔ ورنہ وہ غلطیاں کرتی اور ٹھوکریں کھاتی رہتی ہے۔ دوسری طرف سے دنیا میں خدا کی محبّت کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کا کام یعنی نشر و اشاعتِ کلمۂ توحید جس میں خدا کا سچا عاشق لگا رہتا ہے، سائنس کی مدد سے پختہ بنیادوں پر قائم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جب خدا کی محبّت اور سائنس ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گے تو ایک نئی دنیا وجود میں آئے گی۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ ہمّت کر کے اُٹھے اور سائنس کو خدا کے عقیدہ کے ساتھ بہم کر کے ایک نیا عالمگیر انقلاب پیدا کرے۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات ، شرقیاں را عشق رمزِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر بود نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ عشق را با زیرکی آمیزدہ

قرآن حکیم میں کئی آیات ایسی ہیں جن میں اسلام کے آخری عالمگیر غلبہ کی زوردار پیشگوئیاں

کی گئی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اگر اسلام کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کا ذریعہ خود مسلمان قوم ہی بنے گی۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد:۱۱)

"بیشک خدا کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے حالات کو نہ بدلیں"۔

بے خدا سائنس کی مخالفت

یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ اب مغرب کا فکر بھی بے خدا سائنس کے خلاف ردِّ عمل کر رہا ہے۔ پٹی رم سوروکن (Pitirim Sorokin) جو ہارورڈ یونیورسٹی میں سوشیالوجی کا پروفیسر رہا ہے، اپنی کتاب "ہمارے دور کا بحران" (The Crisis of our Age) میں لکھتا ہے:

> "مذہب اور سائنس کی موجودہ مناقشت خطرناک ہی نہیں غیر ضروری بھی ہے۔ اگر حقیقت کے صحیح اور مکمل نظریہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو پھر وہ دونوں ایک ہی ہیں اور ایک ہی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفات کو عملی دنیا میں بے نقاب کیا جائے، تاکہ انسان کی شرافت اور خدا کی عظمت دونوں آشکار ہوں"۔

اسی طرح سے فیلڈ مارشل سمٹس (Field Marshall Smuts) جو فلسفہ کی ایک نہایت ہی عمدہ اور اونچی کتاب 'کلیت' (HOLIM) کا مصنّف ہے، لکھتا ہے:

> "سچائی کی بے لوث جستجو میں اور نظم اور حُسن کے مشاہدہ کے ذوق کے اعتبار سے سائنس آرٹ اور مذہب کے بعض اوصاف وخواص سے حصہ لیتی ہے۔ یہ کہنا قرینِ انصاف ہوگا کہ شاید سائنس دورِ حاضر کے لیے خدا کی ہستی کا واضح ترین انکشاف ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مستقبل میں نوعِ انسانی جو بڑے بڑے کام انجام دے گی ان میں ایک یہ ہوگا کہ وہ سائنس کو اخلاقی قدروں کے ساتھ ملحق کرے گی اور اس طرح سے اس بڑے خطرہ کو دُور کرے گی جو اس وقت ہمارے مستقبل کو درپیش ہے"۔

لیکن حقیقت کا صحیح اور مکمل نظریہ جس کی روشنی میں سوروکن کے خیال میں مذہب اور سائنس ایک نظر آتے ہیں فقط مسلمان قوم کے پاس ہے۔ کیونکہ خدا کا اسلامی تصوّر خالص اور شرک کی تمام آلائشوں سے پاک ہے۔ دنیا میں اسلام کے سوائے کوئی اور مذہب ایسا نہیں جو خدا کے تصوّر کی پاکیزگی پر اتنا زور دیتا ہو۔ پھر خدا کے اسلامی تصوّر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مظاہرِ قدرت

جن کا مشاہدہ اور مطالعہ سائنسدان کا کام ہے خدا کی ہستی اور صفات کے نشانات ہیں اور خدا کی صفات ان کے اندر آشکار ہیں۔ مظاہرِ قدرت کا علم جسے سائنس کہتے ہیں خدا کے اسلامی تصوّر سے الگ نہیں ہو سکتا۔ یہ حقائق اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ خدا اور خدا کے تصوّر سے پیدا ہونے والی اخلاقی اقدار کو سائنس کے ساتھ ملحق کرنے کا عظیم الشان کام جو فیلڈ مارشل سمٹس کے خیال کے مطابق نوعِ انسانی آئندہ انجام دینے والی ہے، صرف مسلمانوں کے ہاتھ سے ہی انجام پا سکتا ہے۔

نقشِ ناتمام

اگر ہم مسلمانوں کے دینی، علمی، اخلاقی اور سیاسی انحطاط کے اسباب کا تجزیہ کریں تو ان میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بنیادی سبب یہی نکلے گا کہ انہوں نے اپنی تعلیم کے لیے بے خدا سائنس کو اپنا لیا ہے۔ لہٰذا اس سبب کے ازالہ سے ان کا انحطاط زائل ہو سکتا ہے۔ اور قرآن کی پیشگوئیوں کے مطابق ان کے عالمگیر غلبہ کے لیے راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان قوم کا یہ رول مقدر ہے کہ وہ اپنی یونیورسٹیوں میں سائنسی علوم کی نصابی کتابوں میں خدا اور سائنس کا الحاق کر کے اپنے دینی جذبہ کے احیاء اور عقیدۂ توحید کی نشر و اشاعت کا سامان پیدا کریں گے۔ در اصل ہمارے نظریۂ حیات کی ممکنات کے اندر ہی اس بات کی شہادت موجود ہے کہ ہم مستقبل کے اس عالمگیر انقلاب کا باعث بنیں گے جس کی تمنّا اقبال نے کی ہے۔ تاہم جب تک کہ نوعِ انسانی سائنس کو خدا کے عقیدہ کے ساتھ ملحق نہیں کرے گی اس وقت تک وہ اپنے کمال کی جانب جو اس کی منزلِ مقصود ہے قدم نہ اُٹھا سکے گی۔ اور نقّاشِ ازل کا نقش یعنی انسان جس کی تکمیل کے لیے اس نے یہ ہنگامۂ عالم برپا کیا ہے نامکمل رہے گا، کیونکہ عقل اور عشق دونوں مل کر ہی انسان کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ جب دونوں مل جائیں گے تو نہ عقل بے زمام رہے گی اور نہ عشق اپنے مقام سے محروم رہے گا۔ اور جب تک دونوں الگ الگ رہیں گے اس وقت تک نہ عقل اپنا صحیح راستہ پا سکے گی اور نہ ہی عشق اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے گا۔

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی